نیّر مسعود
"ادبستان" دین دیال روڈ
لکھنؤ

بیگم حضرت محل

۱۸۵۷ء میں آزادی کی پہلی جنگ میں اودھ نے انگریزوں کی سخت مزاحمت کی۔ یہ اتنے تعجب کی بات نہیں، جتنی یہ بات کہ یہ مزاحمت معزول واجد علی شاہ کی ایک پردہ نشین بیگم کی سرکردگی میں ہوئی، جنھوں نے سپاہیوں میں ایسا جوش بھر دیا کہ اودھ کی چھنی ہوئی سلطنت ایک بار پھر ہندستانیوں کے قبضے میں آگئی۔ (اگرچہ عارضی طور پر)

ان بیگم کی مختصر روداد یہ ہے:

دہلی میں مغل بادشاہوں کی سلطنت کمزور پڑ جانے کے بعد سے ہندستان میں انگریزوں کی طاقت بڑھتی جا رہی تھی۔ انگریز ہندستان میں تجارت کرنے آئے تھے لیکن اپنی ایسٹ انڈیا کمپنی کی آڑ میں وہ سارے ملک پر حکومت کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے اور دہلی کے ساتھ ساتھ ہندستان کی ہر ریاست پر ان کی للچائی ہوئی نظریں پڑ رہی تھیں، ان میں سب سے اہم اودھ کی ریاست تھی، جس کا دارالسلطنت لکھنؤ تہذیب کے علاوہ تجارت کا بھی بہت بڑا مرکز تھا۔ یہ ریاست کہنے کو آزاد تھی مگر یہاں کی سیاست پر بھی انگریز چھائے ہوئے تھے۔ ان کا ایک ریزیڈنٹ لکھنؤ میں موجود رہتا تھا اور اس ریزیڈنٹ کی مرضی کے خلاف اودھ کے حاکم کچھ نہیں کر سکتے تھے کیونکہ ان میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ انگریزوں سے ٹکر لے سکیں۔ صرف اودھ کے تیسرے نواب شجاع الدولہ نے انگریزوں کے آگے سر جھکانے سے انکار کر دیا اور جنگ کے میدان میں ان کا مقابلہ کیا۔ شجاع الدولہ بہت بہادر اور طاقت ور تھے۔ وہ نہایت عمدہ سپاہی اور لائق سپہ سالار تھے، لیکن وہ بھی انگریزوں سے نہیں جیت سکے اور بالآخر انھیں بھی انگریزوں کے آگے جھک جانا پڑا۔ شجاع الدولہ کے بعد اودھ کے تخت پر سات حاکم اور آئے مگر کسی کی انگریزوں سے ٹکرانے کی ہمت نہ ہوئی اور وہ کٹھ پتلیوں کی طرح انگریزوں کے اشاروں پر چلتے رہے۔

انگریزوں کو یقین اور اطمینان ہو چکا تھا کہ اب اودھ ان کے پیروں کے نیچے ہے اور اب کوئی شجاع الدولہ کی طرح ان کو للکارنے کی ہمّت نہیں کرے گا۔ پھر بھی وہ اودھ کے دربار پر کڑی نظر رکھتے تھے کہ کہیں کوئی ایسا تو نہیں جو ان کی مخالفت کر سکے اور اگر انھیں کہیں پر مخالفت کی کوئی چنگاری بھی نظر آتی تھی اسے فوراً بجھا دیتے تھے۔

لیکن لکھنؤ کے شاہی محلوں میں ایک لڑکی پر ان کی نظر نہیں پڑی، اور اگر ان کی نظر پڑتی بھی تو وہ سوچ نہیں سکتے تھے کہ یہ معمولی لڑکی ان کے راستے میں کبھی دیوار بن کر کھڑی ہو جائے گی۔ شجاع الدولہ کی طرح ان کا مقابلہ کرے گی، شجاع الدولہ کی طرح ہار بھی جائے گی لیکن شجاع الدولہ کی طرح ان کے آگے سر کبھی نہ جھکائے گی۔

اس لڑکی کو کئی نام دیے گئے۔ محمدی خانم، مہک پری، افتخار النساء، راج ماتا، جنابِ عالیہ، لیکن اس کا سب سے مشہور نام ہے: بیگم حضرت محل۔

اودھ کے آخری بادشاہ سلطان عالم واجد علی شاہ سے پہلے ان کے باپ امجد علی شاہ اودھ کے بادشاہ تھے۔ شہزادہ واجد علی کو پڑھنے لکھنے کے علاوہ ناچ گانے سے بھی دل چسپی تھی۔ انھوں نے 'پری خانہ' کے نام سے ایک طرح کا اسکول قائم کیا تھا، جس میں ناچ گانے کی تعلیم دی جاتی تھی۔ پری خانے میں تعلیم پانے والی لڑکیاں پریاں کہلاتی تھیں۔

ایک دن اٹھارہ انیس سال کی ایک لڑکی محمدی خانم اس اسکول میں داخل ہوئی۔ شہزادے نے اس کا نام مہک پری رکھا۔ کچھ دن تک مہک پری ناچنا گانا سیکھتی رہی۔ لیکن پھر شہزادے نے اسے بیوی بنا کر پری خانے سے ہٹا لیا۔ اس کا نام افتخار النساء رکھا۔ ان سے ایک بچّہ پیدا ہوا۔ باپ نے اس کا نام رمضان علی میرزا رکھا اور دادا نے اس کو برجیس قدر خطاب دیا۔

باپ کے مرنے کے بعد جب ۱۸۴۷ء میں واجد علی شاہ بادشاہ ہوئے تو انھوں نے افتخار النّساء خانم کو حضرت محل کا خطاب دیا۔ واجد علی شاہ کی بہت سی بیگمیں تھیں۔ یہ بیگمیں آپس میں الجھتی رہتی تھیں اور بادشاہ کو بھی پریشان کرتی تھیں۔ بادشاہ نے اپنی کتابوں میں جگہ جگہ ان بیگموں کی شکایتیں کی ہیں لیکن ان شکایتوں میں حضرت محل کا نام نہیں آتا۔

حضرت محل بیگموں کے جھگڑوں سے الگ تھلگ ننھے برجیس قدر کی پرورش میں لگی رہتی تھیں۔ لیکن شاید وہ دوسری بیگموں کی طرح محل کے باہر کی دنیا سے بے خبر نہیں تھیں اور خوب جانتی تھیں کہ واجد علی شاہ اور اودھ کی حکومت کس خطرے میں گھری ہوئی ہے۔

یہ خطرہ انگریزوں کا تھا، اودھ کے دوسرے بادشاہوں کی طرح واجد علی شاہ بھی انگریزوں کے سامنے بے بس تھے۔ انھوں نے انگریزوں کی مرضی کے خلاف حتی الامکان کوئی بات نہیں کی، لیکن اب انگریز چاہتے تھے کہ کھلم کھلاّ اودھ پر قبضہ کرلیں۔ اس غرض سے انھوں نے واجد علی شاہ کے خلاف الزاموں کی ایک لمبی فہرست تیار کی اور فروری ۱۸۵۶ء میں بادشاہ سے کہہ دیا کہ آپ حکومت کا انتظام نہیں کر سکتے اس لیے اب اودھ کی حکومت ہم اپنے ہاتھ میں لینے جا رہے ہیں۔ واجد علی شاہ نے ان الزامات کے بہت اچھے جواب دیے۔ لیکن انگریز اودھ پر قبضہ کا فیصلہ کر چکے تھے۔ واجد علی شاہ خوب سمجھتے تھے کہ اگر اس وقت وہ تخت چھوڑنے سے انکار کریں گے تو لڑائی کی نوبت آجائے گی اور لڑائی میں وہ انگریزوں سے جیت نہیں سکتے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اگر لڑائی ہوئی تو ان کا لکھنؤ تباہ ہو جائے گا اس لیے انھوں نے تخت چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا۔

اودھ پر انگریزوں کی حکومت ہو گئی۔ واجد علی شاہ نے ارادہ کیا کہ لندن جا کر انگریزی پارلیمنٹ کے سامنے اپنا مقدمہ پیش کر کے سلطنت کی واپسی کی کوشش کریں۔ اس غرض سے وہ لکھنؤ سے روانہ ہوئے۔ بادشاہ کے ساتھ اس ناانصافی اور لکھنؤ سے ان کے چلے جانے کا رعایا نے بڑا غم منایا اور بہت دنوں تک نظموں اور گیتوں میں ان کی واپسی کی دُعائیں کی گئیں۔ لیکن سلطانِ عالم واجد علی شاہ کو پھر کبھی لکھنؤ آنا نصیب نہ ہوا۔

لکھنؤ سے روانہ ہوتے وقت بادشاہ نے اپنی بیگموں کو عام اجازت دے دی تھی کہ وہ محل چھوڑ کر جا سکتی ہیں۔ چنانچہ بہت سی بیگمیں چلی گئیں، لیکن کئی بیگموں نے محل سے جانا وفاداری کے خلاف سمجھا اور کہیں نہیں گئیں۔ ان میں بیگم حضرت محل بھی تھیں۔

واجد علی شاہ کلکتہ میں جا کر ٹھہرے۔ ادھر لکھنؤ میں انگریزوں کی حکومت تو ہو گئی، مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شہر بھر میں اندر ہی اندر ایک آگ سی سلگ رہی ہے، اور لکھنؤ ہی میں نہیں یہ آگ ہندستان بھر میں سلگ رہی تھی۔ یہ انگریزوں کے خلاف بغاوت کی آگ تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی ہندستان کو استعمار کی زنجیروں میں جکڑ رہی تھی اور ہندستان ان زنجیروں کو توڑنا چاہتا تھا۔ یہ اسی کشمکش کی آگ تھی جو دھیرے دھیرے سلگ رہی تھی اور آخر میرٹھ میں یہ آگ شعلہ بن کر بھڑک اٹھی میرٹھ کے ہندستانی سپاہیوں نے اپنے انگریز آقاؤں کے خلاف بغاوت کر دی۔ اس طرح ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی شروع ہوئی جس کے سورماؤں میں جھانسی کی رانی لکشمی بائی کی طرح اودھ کی بیگم حضرت محل کا نام بھی روشن ہونا تھا

حضرت محل دیکھ رہی تھیں کہ ۱۸۵۷ء کے شعلے میرٹھ، دہلی وغیرہ سے ہوتے ہوئے لکھنؤ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ لکھنؤ میں انگریز جنگ کی تیاریوں میں لگے ہوئے ہیں۔ قریب ہے کہ لکھنؤ بھی انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑا ہو۔ لیکن وہ ابھی خاموشی کے ساتھ حالات کا مشاہدہ کر رہی تھیں۔ آخر ۳۰ مئی ۱۸۵۷ء کو لکھنؤ میں بھی جنگ کا شعلہ بھڑک اٹھا۔ مولوی احمد اللہ شاہ بھی میدان میں اتر آئے اور ہندستانی

فوج نے انگریزی فوج کو دبانا شروع کیا۔ لیکن اس فوج کے پاس کوئی بادشاہ نہ تھا اس لیے کہ واجد علی شاہ کو انگریزوں نے کلکتہ کے قلعہ میں نظر بند کر رکھا تھا۔ طے ہوا کہ شاہی خاندان میں سے کسی کو بادشاہ بنایا جائے۔

اس وقت بادشاہ بننا اپنی جان کو خطرے میں ڈالنا تھا۔ اودھ کا شاہی تخت کانٹوں کی سیج بنا ہوا تھا اور اس سیج پر کوئی بیٹھنے والا نہیں ملتا تھا۔ آخر برجیس قدر پر آ کر نظریں ٹھہریں اور بیگم حضرت محل اس پر تیار ہو گئیں کہ آزادی کی اس خطرناک جنگ میں اپنے چھوٹے سے لڑکے کو سب سے آگے کر دیں۔ وہ جانتی تھیں کہ نام برجیس قدر کا رہے گا مگر کام خود انھیں کرنا ہو گا۔ انھیں معلوم تھا کہ ان کے کندھوں پر ذمہ داری کا بہت بڑا بوجھ آ پڑا ہے۔ اس وقت شاید کسی کو خیال نہ ہو گا کہ حضرت محل اس بوجھ کو اٹھا سکیں گی۔ لیکن سب نے دیکھ لیا کہ جس لڑکی نے محل میں پردے کے اندر سے زندگی شروع کی تھی وہی اب راج ماتا بن کر لڑائی کے میدان میں اس طرح کھڑی ہے جیسے اس کی ساری زندگی تلواروں سے کھیلتے گزری ہو۔

برجیس قدر کی طرف سے منادی کرائی گئی کہ ہم نے اپنی حکومت واپس لے لی ہے اور اب انگریزوں کو یہاں سے نکال دینا ضروری ہے۔ انگریزوں نے اپنی حکومت کے زمانہ میں شاہی فوج اور دوسرے محکموں کے جن ملازموں کو نکال دیا تھا وہ سب واپس آ جائیں۔ اودھ کے زمینداروں اور تعلقداروں کو بھی مدد کے لیے بلایا گیا۔ دیکھتے دیکھتے ایک بڑی فوج تیار ہو گئی۔ ریذیڈنٹ کے رہنے کی عمارت جو بیلی گارد کہلاتی تھی، اس کو گھیر لیا گیا نئے جوش کے ساتھ جنگ جاری ہوئی اور اب بیگم حضرت محل کے جوہر کھلنا شروع ہوئے۔

حضرت محل جنگ کے میدان میں خود موجود رہتیں اور کبھی ہمّت نہیں ہارتی تھیں۔ محل کی دوسری بیگمیں ان کو دیکھتی تھیں اور حیران تھیں کچھ ان سے جلتی تھیں، کچھ ان کی تعریف کرتی تھیں، لیکن ان کی بہادری کی سب قائل تھیں۔ ایک بیگم نے واجد علی شاہ کو خط میں لکھا:

"میں نہیں سمجھتی تھی کہ حضرت محل ایسی آفت کی پرکالہ ہے۔ خود ہاتھی پر بیٹھ کر تلنگوں کے آگے آگے فرنگیوں کا مقابلہ کرتی ہے۔ آنکھ کا پانی ڈھل گیا ہے۔ اس کو ہراس مطلق نہیں ہے۔"

مگر دوسری بیگم نے بادشاہ کو لکھا:

"حضرت محل نے ایسی بہادری دکھائی کہ دشمن کے منھ پھر گئے۔ بڑی جی دار عورت نکلیں۔ سلطان عالم کا نام کر دیا کہ جس کی عورت ایسی ہو جو مردانہ وار مقابلہ کر سکتی ہو تو اس کا مرد کیسا بہادر اور شجاع ہو گا۔"

حضرت محل کی فوج نے بڑی تیزی سے کامیابیاں حاصل کرنا شروع کیں۔ تاریخ بتاتی ہے:

"صرف گیارہ دن میں اودھ کے کسی ضلع میں برٹش گورنمنٹ کی طرف سے کوئی حاکم نہ تھا اور انگریزی عمل داری خواب معلوم ہوتی تھی۔"

اور یہی بات ایک انگریز افسر سر ہنری لارنس نے لفٹنٹ گورنر کو خط میں اس طرح لکھی:

"تمام ضلعوں میں حکومت ہمارے ہاتھ سے نکل گئی ہے اور روز بروز حالت بگڑتی جا رہی ہے۔ سارے تعلقداروں نے ہتھیار اٹھا لیے ہیں اور بعضوں نے دیہاتوں پر قبضہ کر لیا ہے۔"

دراصل حضرت محل کو دو لڑائیاں لڑنا پڑ رہی تھیں۔ ایک محل کے باہر انگریزوں سے اور دوسری لڑائی محل کے اندر دوسری بیگموں سے، جن کا کہنا تھا کہ اگر بیلی گارد کے انگریزوں کی جان لی گئی تو کلکتہ میں واجد علی شاہ اور ان کے ساتھیوں کو قتل کر دیا جائے گا۔ محل کے اندر کی عورتوں میں سے کچھ کے بارے میں شبہ تھا کہ وہ انگریزوں سے ملی ہوئی ہیں اور یہاں کی خبریں وہاں پہونچاتی ہیں۔ مگر حضرت محل دونوں میدانوں میں بڑی بہادری کے ساتھ جمی رہیں۔

کچھ دن بعد دہلی میں بہادر شاہ ظفر کے پاس اودھ کی طرف سے سفیر بھیجا گیا۔ اور برجیس قدر نے بادشاہ کو عرضداشت لکھی:

"حضرت ظلِ سبحانی خلیفۃ الرحمانی، خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ

اس خاکسار عقیدت نہاد نے کافرانِ فرنگ کو تہِ تیغ بے دریغ کیا۔ چند کفار بد نہاد بیلی گارد میں باقی ہیں، وہ بھی مارے جاتے ہیں۔ مگر امیدوار عنایت خسروانہ کا ہوں کہ جو مہربانی سرکارِ حضور سے میرے بزرگوں کے ساتھ رہی تھی وہی پرورش حضور کو میرے حق میں بھی چاہیے...“

اور بہادر شاہ ظفر نے جواب میں اس طرح ان کا حوصلہ بڑھایا:

”فرزند ارجمند مرزا برجیس قدر بہادر، شاہِ اودھ آفریں ہو کہ چھوٹے سے سِن میں تم نے بڑا کام نام کیا .... تمہارے واسطے مہر خطاب بھیجی جائے گی۔ خاطر جمع رکھو۔ جو ملک قدیم تمہارا تھا، اس سے زیادہ عطا ہوگا۔“

یہ سفیر ابھی وہیں تھا کہ دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا۔ سفیر بڑی مشکل سے جان بچا کر لکھنؤ واپس آیا اور اس نے حضرت محل کو بتایا کہ دہلی کا خاتمہ ہوچکا۔ پھر خبر آئی کہ کان پور میں ہندستانیوں کی فوج انگریزوں سے شکست کھا کر لکھنؤ کی طرف چلی آرہی ہے اور اس کے پیچھے پیچھے انگریزی فوج ہے۔ یہاں بیلی گارد گولوں سے چھلنی ہوگیا تھا لیکن اس پر ہندستانی فوج کا قبضہ نہیں ہو پایا تھا۔

انگریزوں کے پہنچنے سے پہلے پہلے بیلی گارد کو لینے کے لیے اس پر ایک اور بھرپور حملہ کیا گیا۔ قیصر باغ میں حضرت محل رات بھر جاگتی رہیں اور اب جھوٹی سچی خبریں پھیلنا شروع ہوئیں۔

ایک خبر یہ بھی آئی کہ بیلی گارد پر ہندستانیوں کا قبضہ ہوگیا۔ پھر یہ خبر غلط نکلی اور نئی خبر آئی کہ کان پور سے بھاگ کر آتی ہوئی فوج میں انگریزوں نے اپنی فوج ملا دی۔ پھر خبر آئی کہ کان پور کی انگریزی فوج سر پر چلی آرہی ہے۔ اسی کے ساتھ یہ خبر پھیلی کہ انگریزوں نے بیلی گارد سے باہر نکل کر ہندستانی فوج کو شکست دے دی ہے اور اب وہ قیصر باغ کی طرف آرہے ہیں۔ یہ خبر سنتے ہی قیصر باغ میں بھگدڑ مچ گئی۔ لیکن حضرت محل نے قیصر باغ کے تمام پھاٹک بند کرا دیے کہ کوئی شخص باہر نہ جانے پائے۔

اب جنگ کا نقشہ بگڑ چکا تھا۔ انگریز جنرلوں اوٹرام اور ہیولاک کی فوجیں ہندستانی فوجوں کو ہٹاتی ہوئی بیلی گارد میں داخل ہوگئیں اور اب انھوں نے پلٹ کر قیصر باغ پر حملہ کر دیا۔ باغ کی ایک دیوار پھٹ گئی اور دوسری بیگموں نے حضرت محل کو کوسنا شروع کر دیا۔

دھیرے دھیرے پورے لکھنؤ پر انگریزوں کا قبضہ ہوتا چلا گیا اور آخر انگریزی فوجیں قیصر باغ میں داخل ہوگئیں۔ اسی وقت ہندستانی فوج کا بھی ایک دستہ آپہنچا اور قیصر باغ کے اندر زبردست لڑائی چھڑ گئی۔ باغ کی کیاریوں میں خون بہنے لگا اور لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔ لیکن آخر یہاں بھی انگریز جیتے۔ اب حضرت محل قیصر باغ کو خالی کرنے پر مجبور ہوگئیں۔ وہ گھسیاری منڈی کی طرف والے پھاٹک سے عورتوں کے ایک قافلے کے ساتھ باہر نکلیں۔

راستے میں لوگ اس قافلے کو دیکھ دیکھ کر روتے تھے۔ حضرت محل حسین آباد میں جا کر ٹھہریں، اور ایک بار پھر انھوں نے بچی کھچی فوج کو اکٹھا کر کے انگریزوں سے ٹکر لی۔ لیکن ان کی یہ کوشش بھی ناکام ہوگئی۔

حضرت محل لڑائی ہار گئی تھیں مگر ہمت نہیں ہاری تھیں۔ اس وقت جب ان کے جیتنے کی کوئی امید نہیں رہی تھی، انھیں انگریزوں کی طرف سے پیام ملا کہ آپ کا ملک آپ کو واپس کر دیا جائے گا۔ آپ لڑائی بند کر دیجیے لیکن حضرت محل نے اس پیغام کو اور ایسے ہی کئی پیغاموں کو ٹھکرا دیا۔ وہ انگریزوں کی دی ہوئی نہیں، اپنے بازوؤں کے زور سے لی ہوئی حکومت چاہتی تھیں وہ اسی کے لیے میدان میں اتری تھیں۔ جب ان کی کوشش ناکام ہوئی تو انگریزوں کی پیش کی ہوئی کوئی رعایت قبول کرنے کے بجائے انھوں نے ہندستان چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا اور وہ نیپال روانہ ہوگئیں۔

راستے میں بہرایچ کے قریب بونڈی کے مقام پر انھوں نے پڑاؤ ڈالا۔ لکھنؤ کے ہارے ہوئے فوجی دستے جو ادھر ادھر بکھر گئے تھے بونڈی میں آکر جمع ہوگئے اور کچھ دن کے لیے بونڈی چھوٹا سا لکھنؤ معلوم ہونے لگا۔ حضرت محل بونڈی ہی میں تھیں جب انگلستان کی ملکہ وکٹوریہ کا فرمان ہندستان پہنچا جس میں ہندستانیوں سے بہت اچھے اچھے وعدے کیے گئے تھے اس فرمان کے پہنچنے پر بہت سے لوگ واپس چلے گئے مگر حضرت محل نے اس کے جواب میں ایک فرمان جاری کیا، جس میں شروع سے اب تک انگریزوں کی زیادتیوں کا پردہ کھول دیا گیا تھا۔

حضرت محل نے اس فرمان میں ایک سوال بھی کیا تھا کہ انگریزوں نے

اس بہانے سے کہ ہمارا انتظام اچھا نہیں تھا اور ہماری رعایا ہم سے خوش نہیں تھی، ہمارے ہاتھوں سے ہماری حکومت لے لی۔ اگر ایسا تھا تو رعایا نے اتنی وفاداری سے ہمارا ساتھ کیوں دیا اور ہماری خاطر اپنی جانیں کیوں قربان کیں؟ یہ وہ سوال تھا جس کا آج تک جواب نہیں مل سکا

بونڈی میں بھی حضرت محل کی فوجوں نے ایک دفعہ پھر انگریزی فوجوں سے زبردست ٹکر لی، مگر ایک بار پھر انھیں ہارنا پڑا۔ اب حضرت محل بالکل مایوس ہوگئیں اور برجیس قدر اور کچھ دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ نیپال کی سرحد میں داخل ہوگئیں۔ انھیں بڑی مشکل سے نیپال میں قیام کی اجازت ملی۔

ہندستان میں انگریزوں کی حکومت جم گئی اور حضرت محل نیپال میں زندگی گزارتی رہیں۔ بہت دنوں بعد انگریزی حکومت کی طرف سے ایک آدمی برجیس قدر کی تصویر کھینچنے نیپال بھیجا گیا۔ اس نے حضرت محل کو حکومت کا یہ پیغام دیا کہ ہماری خواہش ہے کہ آپ ہندستان واپس آکر عیش و آرام کے ساتھ جہاں جی چاہے رہیے۔ آپ کا آنا ہم اپنے لیے فخر کی بات سمجھیں گے۔ آپ کی شان کے مطابق آپ کا وظیفہ مقرر کیا جائیگا اور آپ کا شاہی احترام ہوگا۔

حضرت محل نے یہ پیشکش قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ جس ملک میں وہ راج ماتا تھیں، جہاں انھوں نے آزادی کی جنگ کی سرداری کی تھی، اب وہاں دشمن کے مہمان کی طرح رہ کر وہ کیا کرتیں۔ انھوں نے آزاد ہند کے خواب دیکھے تھے۔ غلام ہندستان میں رہنا انھیں کیونکر گوارا ہوتا؟

اس لیے بیگم حضرت محل پھر کبھی ہندستان نہیں آئیں بلکہ وہ نیپال میں خاموشی کے ساتھ زندہ رہیں اور وہیں ایک دن خاموشی کے ساتھ مر گئیں۔ لیکن شاید مرتے وقت بھی وہ آزاد ہندستان کا خواب دیکھ رہی ہوں۔

□□

آخر کار واجد علی شاہ ۱۳ مارچ کی رات میں کلکتہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ نئی برطانوی انتظامیہ نے صرف پانچ سو لوگوں کو ان کے ساتھ جانے کی اجازت دی تھی چنانچہ اتنے ہی لوگ ان کے ساتھ جا سکے۔

مندرجہ بالا بیانیہ برطانوی حکمرانوں کی تحریروں کی بنیاد پر تیار کیا گیا ہے۔ مؤلف نے کسی بھی مسئلے پر اپنی رائے ظاہر کرنے سے حتی الامکان احتراز کیا ہے اور جذبات کو دخل انداز ہونے کی اجازت نہیں دی ہے۔

لیکن اب دو تین باتیں اسے بھی کہنی ہیں۔

۱۔ واجد علی شاہ کی معزولی سے اودھ کے عوام صدمہ کی کیفیت میں تھے اور اگر سارا شہر نہیں تو آبادی کا ایک بڑا حصہ ضرور ان کے ساتھ جانا چاہتا تھا، ورنہ صرف پانچ سو لوگوں کو ان کے ساتھ جانے کی اجازت کیوں دی جاتی۔

۲۔ عوام اور فوجی بھی ان کا بے حد احترام کرتے تھے اور انھوں نے معزول بادشاہ کے فرمان کے پیش نظر خون کے آنسو پی کر صبر و ضبط کو ہاتھ سے نہ جانے دیا، ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ ایک پوری بساط پلٹ دی جائے اور کسی کی نکسیر بھی نہ پھوٹے۔

۳۔ بعض حلقوں کا خیال ہے کہ واجد علی شاہ نے تلوار اٹھائی ہوتی تو وہ فوراً ہیرو بن جاتے۔ یقیناً وہ ہندستان کی جنگِ آزادی کے بہت بڑے ہیرو بننے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ لیکن اس وقت تلوار اٹھا لینے سے نہایت معمولی مزاحمت کے بعد یقینی شکست اور ہزاروں کی موت کے علاوہ کچھ حاصل نہ ہوتا۔ واجد علی شاہ نے نئے معاہدہ پر دستخط نہ کرنے میں جس ثابت قدمی کا ثبوت دیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔

۴۔ برطانوی پارلیمنٹ سے اپیل کرنے کا فیصلہ ایک مدبرانہ قدم تھا۔ اس فیصلہ سے انھوں نے خود کو ایک مدبّر حکمراں بھی ثابت کر دیا۔ زندگی نے وفا نہ کی، یہ بات دوسری ہے۔

□□

...المناک باب ——— صفحہ ۱۷ کا بقیہ

کہ وہ اس قومی لوٹ سے محروم ہو جائیں گے جس کا بازار گرم تھا۔